پیش لفظ

صدیوں سے ہم زوال کے گردابِ شر میں گرفتار ہیں۔ تاریخ جس کی مٹھی میں ہو بدقسمتی سے اب وہ ہم نہیں۔ لیکن اس تلخ اور دل گرفتہ حقائق کو تسلیم کرنے کا ہم میں یارا نہیں۔ جب تک زوال کی ہلا مارنے والی شدت کا احساس نہ ہو اس کے جملہ ابعاد کا نہ تو ادراک ممکن ہے اور نہ ہی اس اذیت ناک صورتحال سے نجات کی کوئی مضطربانہ تحریک ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں سے ہمارے مفکرین ہمارے زوال پر کلام کرتے رہے ہیں جس سے یہ احساس تو عام ہوتا رہا کہ کہیں کوئی چیز کھوئی گئی ہے لیکن وہ گڑ بڑی کہاں واقع ہے اس کی نشاندہی کی سنجیدہ کوششیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ بغداد اور غرناطہ کے سقوط کے بعد سے اب تک اسباب زوال پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اتنا کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اہل دانش رأس المسئلہ سے اپنا دامن کیوں بچاتے رہے۔ پھر ان تحریروں کی حیثیت بھی بے ربط تبصروں سے زیادہ نہیں۔ مذہب جب علمائے سابقہ کی تقلید قرار پائے اور یہ سمجھا جانے لگے کہ پچھلوں نے غور وفکر کا تمام کام انجام دے ڈالا ہے، دینی زندگی کے آسان فارمولے اب فقہاء کے دبستانوں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں تو اس تقلیدی ذہن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے متقدمین کے سرمائے کا تنقیدی محاکمہ کر سکے گا۔ جب یہ سمجھا جانے لگے کہ پچھلوں نے اپنی تحریروں میں وحیِ ربانی کا تمام تر عطر کشید کر لیا ہے تو بھلا قرآن مجید کو از سرِ نو کھولنے اور اس کی روشنی میں اپنے تہذیبی اور مذہبی سرمائے کے محاکمے کا خیال کیوں کر پیدا ہو سکتا تھا۔ کہنے والوں نے ضرور کہا کہ ہمارا زوال دین سے انحراف کی وجہ سے عمل میں آیا ہے۔ دین کی طرف دوبارہ واپسی ہمیں ازسرِنو منصبِ سیادت پر فائز کر دے گی۔ اصولی طور پر اس جواب کی تمام تر صحت کے باوجود ہم یہ بتانے سے قاصر رہے کہ رجوع الی اللہ والرسول کا یہ عمل آج کی دنیا میں کس طرح انجام پا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم تخصیص کے ساتھ اس خرابی کی نشاندہی نہیں کر سکے جو منصبِ کارِنبوت سے ہماری معطّلی کا سبب بنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے دین کی طرف واپسی کی شدید خواہش اور اپنی گمشدہ عظمت کی باریابی کی

تمام تر کوششوں کے باوجود ہم آج بھی زوال کے گرداب بے کنار میں پوری طرح گرفتار ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آنے والا لمحہ ہمارے بے سمت کارواں کو اپنی اصل منزل سے مزید دور کرتا جاتا ہے۔

ہم یہ چاہتے ضرور ہیں کہ وحی کی تجلی ایک بار پھر ہماری راہوں کو منور کردے، بے سمت کارواں ایک بار پھر منزل کی طرف گامزن ہوجائے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وحی کی طرف واپسی کے لئے تمام ترکیبیں علمائے متقدمین کے منہج سے مستعار لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اہلِ یہود کی طرح ہم نے بھی اپنے بزرگوں کی فہم وفراست کو ناقابل خطا باور کررکھا ہے۔ ابتدائی نسلوں کے فیصلے اور ان کی فہم وبصیرت ہمارے درمیان وحی جیسے تقدس کی حامل ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کے تازہ بہ تازہ مطالعے کو اپنے حدامکان سے باہر سمجھتے ہیں۔ وحی ربانی کے گرد مفروضہ سلف صالحین کا گھیرا اتنا سخت ہے کہ صدیوں سے ہم نے عملی طور پر قرآن مجید سے راست رہنمائی کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے تہذیبی اور علمی سرمائے کو قرآن مجید سے بھی کہیں زیادہ اہمیت دینے لگے ہوں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم صدیوں پر مشتمل فکری بحران کے سخت لمحات میں بھی کتاب ہدایت کو منجمد کرنا تو گوارہ کرلیں لیکن ہمارے لئے یہ قابل قبول نہ ہو کہ ہم اسلاف کی فہم کو خیرباد کہہ سکیں۔ حالانکہ ابتدائی صدیوں میں ہی دانش یونانی، ہندایرانی فلسفوں اور قدیم رہبانیت کے زیراثر مسلم فکر میں جو بحرانی کیفیت پیدا ہوئی تھی اور جس نے بالکل ابتدائی صدیوں میں ہمارے یہاں تاریخ اور وحی کے سلسلے میں سنگین نوعیت کے سوالات پیدا کردیئے تھے ہم اس کے اسرار وعواقب سے بھی ناآشنا نہیں۔ فتنۂ قتل عثمان سے لے کر عباسی بغداد کی جاہ وحشمت تک ہم محورِ وحی سے مسلسل باہر آنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اجنبی تصورات کے زیراثر اسلام جیسے الوہی اور ابدی کلمہ کو تہذیب کی جلوہ نمائیوں میں دیکھنے کی کوشش ہونے لگی۔ اسلام کے بجائے اسلامی تہذیب ہماری شناخت کا حوالہ بنتی گئی۔ اس طویل عرصے میں سلف صالحین سے کہیں زیادہ اجنبی علوم و ثقافت سے متاثر اہل فکر اجنبی paradigm میں فہمِ وحی کی سنجیدہ اور غیرسنجیدہ کوشش کرتے رہے۔ کوئی دانش یونانی کا اسیر ہوا تو کسی نے قدیم رہبانیت کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی ناکام کوشش، کوئی ان التباساتِ فکری کی اصلاح کے لئے تاریخ سے مدد کا طالب ہوا تو کوئی اس نتیجہ پر پہنچا کہ ضرورت تشریح و تعبیر اور مباحث سے کہیں زیادہ ایک بدوی رویے کی ہے۔ فکری بحران کے اس دور میں اتنے بہت سارے رویے ان حضرات کی اپنی فہم وبصیرت کی مرہونِ منت تھے۔ کسی ایک رویے کی مکمل صحت پر یقین کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسرے رویوں سے یکسر دست بردار ہوجائیں۔ گویا کسی مسئلہ پر اگر خود سلف صالحین

باہم متصادم ہوں تو ان سبھوں کو بیک وقت صحیح قرار دینے کے غیر عقلی موقف کے بجائے مناسب ہوگا کہ ہم ان تمام رویوں کا وحی کی روشنی میں محاکمہ کریں تا کہ ہمارے لئے متقدمین کے التباسات کو سمجھنا آسان ہو اور ہم وحی سے راست اکتساب کے لئے پچھلوں سے کہیں زیادہ پر اعتماد دکھائی دیں۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب آج کا انسان خود اپنے آپ کو وحی کا مخاطب قرار دے اور اسے، جیسا کہ اقبال نے کہا ہے، ایسا محسوس ہو گویا قرآن مجید پچھلی نسلوں کے لئے ہی نہیں نازل ہوا تھا بلکہ خود اس کے قلب پر اس کا نزول ہو رہا ہے۔ قرآن کا مخاطب جب تک اس اعتماد سے سرشار نہ ہو وہ متقدمین کے التباسات فکری سے اپنا دامن نہیں بچا سکے گا اور قرآن مجید کی طرف اس کی واپسی کی تمام خواہش قدیم تعبیرات کے حصار میں دم توڑ دے گی۔

وحی کی بازیافت کے بغیر ہمارے جاری زوال پر بندھ باندھنا ممکن نہیں۔ یہی وہ رأس المسئلہ ہے جس پر حیرت انگیز طور پر ہمارے اہل فکر نے بہت کم توجہ دی ہے۔ وحی سے ہماری غفلت کوئی تازہ بہ تازہ phenomenon نہیں۔ اس کی ابتداء تو اسی وقت ہوگئی تھی جب قراء کے مقابلے میں حفاظ حدیث کا سماجی مرتبہ بلند ہونے لگا تھا۔ آثار و اقوال کی ترتیب کے دوران تاریخ کے سلسلے میں ہمارے بدلتے تصورات نے قرآن مجید کی طرف ہمارے رویے میں تبدیلی پیدا کی۔ بہت جلد دانش یونانی کے زیر اثر غیر قرآنی مباحث اور طویل طولانی قصوں نے تفسیری حواشی میں اپنی جگہ بنالی۔ قرآن مجید پر وقفہ وقفہ سے حجابات کی پرتیں کس طرح پڑتی گئیں رأس المسئلہ کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حد تو یہ ہے کہ صدیوں کی تفسیری کاوشوں کے باوجود آج بھی قرآن مجید کو بحیثیت کتابِ عمل قبول کیا جانا باقی ہے۔ کل اگر خلق قرآن کے مسئلہ نے ہماری تمام تر دانشورانہ توانائیوں کو اپنی طرف مرکوز کر رکھا تھا تو آج ہم قرآن کے اعجاز علمی (یعنی اس کے اندر پائے جانے والے سائنسی حقائق) کو غایتِ وحی قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ ہر عہد کے پیدا کردہ رجحانات و التباسات کی روشنی میں مطالعۂ قرآنی کی یہ روش غایتِ وحی کو شکست دیتی رہی ہے۔ ہمارا فکری کارواں جو عہدِ عباسی میں اپنے اصل راستے سے دور جا پڑا تھا آج بھی واپسی کا منتظر ہے۔ جب تک وحی کو غایت وحی کے تناظر میں سمجھنے کا چلن عام نہ ہو قرآنی مطالعات کے بے مغز علمی مباحث ہماری مدد کرنے سے قاصر رہیں گے اور ہمارے ذہنوں میں اسلام کا مفہوم عباسی بغداد کے شوکت اسلام سے خلط ملط ہوتا رہے گا۔

امت مسلمہ کے زوال کا مطالعہ کسی قوم کے زوال کے بجائے ایک تصور حیات کے زوال کی حیثیت سے کیا جانا چاہئے جبھی یہ ممکن ہے کہ ہم زوال کے جملہ ابعاد کو مستحضر کرسکیں۔ اسلامی تہذیب ایک گمراہ کن

اصطلاح، ایک خیال عبث (false metaphor) ہے۔ اسلام کو کسی مخصوص تہذیبی قالب میں برتا جانا ممکن نہیں۔ ایک آفاقی پیغام کو کسی نسلی، لسانی یا مقامی ثقافت کا اسیر نہیں بنایا جاسکتا۔ جو لوگ عباسی بغداد کو اسلامی تہذیب کا عہدِ زریں قرار دیتے ہیں وہ دراصل عہدِ رسول کی مدنی ثقافت کی عظمت سے ناآشنا ہیں۔ ان کی نگاہیں جاہ وحشم کے سطحی مظاہر میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔ اسلام عرب امپائر کے قیام کے لئے ہرگز نہیں آیا تھا۔ ہاں عملی طور پر یہ ہوا ضرور ہے کہ امپائر بلڈنگ کے عہد میں ہمارے اہلِ فکر کی ایک قابلِ ذکر تعداد نے حکمرانوں کے جذبہ توسیع پسندی کو اسلامی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی۔ منحرف سیاسی قیادت اور امام غیر عادل کی رہنمائی میں اسلام کے نام پر ریاست کی ترتیب وتنظیم اور اس کی توسیع وغلبہ کے جو مظاہر دنیا نے دیکھے ہیں اس سے یہ تاثر عام ہوا ہے کہ اسلام، انسانیت کی عمومی رہنمائی سے کہیں زیادہ، مسلم قوم کے غلبہ کی شاہ کلید ہے۔ اسلام کا یہ تہذیبی رنگ و روپ اس مدنی قالب سے میل نہیں کھاتا جو صرف کلمۂ (تقلیب انگیز خیال) سے عبارت تھا جس کے پیچھے قوموں کی کوئی تاریخ نہ تھی اور جس نے وقت کے نام نہاد اہل ایمان (یہود ونصاریٰ) کی جھولی میں اپنا وزن ڈالنے کے بجائے یہ کہہ کر ان سے اپنا دامن چھڑا لیا تھا کہ ﴿صبغة الله ومن احسن من الله صبغة﴾۔

مسلمِ حنیف بننے کی یہ دعوت اور کونوا ربانیین کا سحر انگیز آفاقی نعرہ غایت وحی سے عبارت تھا، اس کی بنیادیں وحی کے اندرون میں تھیں۔ وحی سے متاثر یا اس کی سرحدوں پر پائی جانے والی ثقافت میں نہیں۔ تب کونوا ربانیین کی ہر دعوت کسی تہذیبی شناخت سے نہیں بلکہ فکر وعمل میں تبدیلی سے عبارت تھی۔ مسلم حنیف بننے کا عمل تمام تہذیبی سرحدوں سے پرے ایک ایسا آفاقی خیال سمجھا جاتا تھا جس نے انسانی اجتماعی زندگی کے تمام سابقہ تصورات کو باطل قرار دے ڈالا تھا۔ تقلیب انگیز کلمہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والا مسلمِ حنیف ایک ایسا شخص تھا جسے صحیح معنوں میں کائناتی شہری کہا جاسکے۔ تب مسلم حنیف بننے کی ہر دعوت بندوں پر عبودیت کے لامتناہی امکانات وا کرتی تھی۔ فارس کے سلمانؓ اور حبشہ کے بلالؓ، ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح اپنے آپ کو اس فکری قبیلہ کا فرد سمجھتے تھے جس کی بنیادوں میں عرب وعجم، سیاہ وسفید اور رنگ و نسل کی مروجہ روایات کا کوئی دخل نہ تھا۔ ﴿ان اکرمکم عندالله اتقاکم﴾ کے عملی مظاہر نے اسلام کو ایک رویے کے طور پر متعارف کرایا تھا شناخت کے طور پر نہیں۔ تب اسلام ایک ایسا کھلا دروازہ تھا جہاں گم گشتہ انسانیت کے قافلے جوق در جوق داخل ہوتے اور ہر شخص اپنی بساط بھر اپنے لئے سپردگی کے امکانات وا پاتا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے دین کو Institutionalize کر رکھا تھا یا جو دین کی آفاقیت کو فرقۂ موسوی یا

عیسوی سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے انھیں بھی ایک آفاقی معاشرے کے قیام میں کھلے عام شمولیت کی دعوت دی گئی ﴿یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم﴾ گویا ایک صلائے عام تھی۔ زندہ ضمیر جہاں بھی ہو اسے دعوت دی گئی کہ رنگ ونسل سے ماوراء، قبائلی اور ثقافتی شناخت سے پرے، سپردگی کی بنیاد پر وحدت انسانیت کا جو قافلہ چل نکلا ہے اس میں شریک ہونے سے وہ محروم نہ رہ جائے۔ وحی کا یہ امید افزا آفاقی پیغام ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر قسم کے ناہنجاروں، گنہگاروں کو اپنی آغوش رحمت میں لے لے گا۔ تب وحی ربانی بابِ مغفرت کا احساس دلاتی، دروازہ کھلے ہونے کا احساس مایوس ڈوبتے نفوس میں بھی امید کی جوت جگاتا۔ البتہ جب سے اس کتاب ہدایت کو کتاب قانون یا کتاب فقہ کے طور پر پڑھنے کا رواج پیدا ہوا اور ہمارے شارحین عملی طور پر ﴿و قالوا کونوا هودا او نصاریٰ﴾ کے نقیب بن گئے، ہم ربانین یا مسلم حنیف بنانے کے بجائے ساری توجہ وقت کا یہود ونصاریٰ یعنی مروجہ مسلمان بنانے پر صرف کرنے لگے۔ اسلام رویے کے بجائے شناخت کی حیثیت سے متعارف ہوتا گیا۔ قرآن کی فقہی تعبیر نے اسلام کے سلسلے میں صرف دوسروں کو بند دروازہ ہونے کا احساس نہیں دلایا بلکہ ملت اسلامیہ کا اندرونی ڈھانچہ بھی سخت انتشار وافتراق کا شکار ہوگیا۔ اہل کلمہ کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی تکفیر کو عین خدمت اسلام قرار دیا اور تلبیس وتکفیر کے اس ہنگامے میں یہ پتہ لگانا مشکل ہوگیا کہ واقعی مسلمان کہلائے جانے کا حقدار ہے کون؟ صدیاں گزریں بنیادی عقائد کے سلسلے میں فقہاء کوئی متفقہ محضر نامہ پیش کرنے میں ناکام رہے۔ مختلف عہد میں عقیدے کی مختلف کتابیں اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ قرآنی دائرۂ فکر سے باہر دانشِ فقہ کے حصار میں کامل سپردگی کا وہ ایجنڈہ کس طرح کھویا گیا۔ ایک طرف تو قرآن کی یہ تلقین کہ ﴿ان الله یفصل بینهم یوم القیامة﴾ اور دوسری طرف مختلف فرقوں کے ذریعے مرتب کئے جانے والی کتب عقائد کا یہ اصرار کہ مسلمان ہونے کے لئے ان بیانات کو قبول کرنا لازم ہے۔ علماء جب خود کو وحی کا طالب علم سمجھنے کے بجائے religious authority قرار دے ڈالیں تو ان التباسات کا پیدا ہونا فطری ہے۔

وحیٔ ربانی جو عہد رسول میں منتشر اور متفرق انسانیت کو وحدت میں پروتی تھی؛ جو برملا اس بات کا اعلان کرتی تھی کہ تمام سابقہ پیغمبر اور ان کے قدسی صفات متبعین ایک ہی خانوادۂ توحید کے فرد ہیں۔ ابراہیم و یعقوب اور ان کے نبوی خانوادوں کا سلسلہ ہو یا نبی اسمٰعیل کے سلسلے سے تعلق رکھنے والا یہ نبی، یہ سب کے سب ان ہی قدسی صفات سپرد کردہ نفوس کی جگمگاتی کہکشاں ہیں۔ جو لوگ قدسیوں کے اس

کارواں میں شامل ہونا چاہتے ہوں ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ سابقین مسلم حنفاء سے لاتعلقی کا اظہار کریں۔ ﴿لانفرق بين احد من الرُّسُله﴾ کے بیان نے ہر قوم اور ہر خطّے کے مسلم حنیف کو ایک وحدت میں پرو دیا تھا۔ اہل یہود کا نسلی تفاخر یا اہل نصاریٰ کا یہ دعویٰ کہ نجات صرف ان ہی کے فرقے سے وابستہ ہو جانے میں ہے، اس آفاقی دعوت کے تناظر میں اپنا وزن کھو چکا تھا۔ قرآن کا اصرار تھا کہ یہ نبی کوئی نئی دعوت یا نیا دین لے کر نہیں آیا اور نہ ہی اسے کسی نئی امت کی تشکیل مقصود ہے بلکہ اس کا کام دین براہیمی کا احیاء ہے۔ وہی ابراہیم جو ہر دور کے مسلم حنیف کے لئے ایک لائق اتباع مثال ہے۔ قرآن کا یہ انداز تخاطب مختلف فرقوں اور گروہوں میں پائے جانے والے مسلم حنیف کو جوڑنے کی ایک کامیاب کوشش تھی جس کی قیادت پر اب تاریخ کے آخری لمحے تک محمد رسول اللہ کو فائز کیا گیا ہے۔ ۲۳ سالوں کی مختصر نبوی زندگی کی حیرت انگیز کامیابی کی کلید اسی وسیع النظر قرآنی فکر میں ہے۔

یہ کتاب بنیادی طور پر اسی phenomenon کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کس طرح رفتہ رفتہ وحی کے بجائے متعلقاتِ وحی کو اس قدر اہمیت ملتی گئی کہ مسلم حنیف ہونا بڑی حد تک ایک تہذیبی شناخت بن کر رہ گیا۔ وہ کتاب جو ﴿هدى للمتقين﴾ کے دعوے سے شروع ہوتی ہے اس پر فقہاء کی تعبیرات نے، ایسا محسوس ہوا، دوسری ثقافت کے متقین کے لئے دروازہ بند کر دیا ہو۔ وحیٔ ربانی کی خالص فقہی تعبیر اور پھر اس تعبیر کو مغز دین قرار دینے کے نتیجے میں بہت جلد یہ آفاقی امت جسے سیادت عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، فرقۂ محمدی کی نفسیات میں محصور ہو گئی۔ مسائل عالم سے اپنا رخ موڑ کر اور عام انسانیت کی فلاح سے دست بردار ہو کر ہماری تمام تر توجہ ایک مخصوص ثقافتی شناخت والی امت مسلمہ پر مرکوز ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ہمارے فقہاء نے دنیا کو اسلامی اور غیر اسلامی سرزمین میں بانٹ ڈالا اور ایسا محسوس ہوا کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ سیادت عالم سے ہماری کنارہ کشی دراصل وحی کے سلسلے میں گمراہ کن تعبیرات سے پیدا ہوئی تھی۔ صدیاں گزریں وحی پر پڑنے والے حجابات میں اضافہ ہوتا رہا۔

ہم جب تک پچھلی غلطیوں کو درست نہیں کرتے ہمارا اگلا ہر قدم مزید التباسات کو جنم دے گا۔ کوئی گیارہ سو عرصے پر محیط ہمارا فکری سفر اس خیال کی توثیق کرتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان التباسات کی پیدا کردہ ہولنا کیوں کا فی الفور ادراک کریں کہ ایسا کرنا ہمیں اس گرداب شر سے نکلنے کے لئے مضطرب کر دے گا اور پھر جیسا کہ اللہ کا وعدہ ہے ﴿والذين جاهدوا فينا ليهدينهم سبلنا﴾ ہم

اپنے لئے امکانات کی نئی وادیاں وا پائیں گے۔ اس جلد میں ہم نے اپنی گفتگو کو صرف التباسات کے ادراک تک محدود رکھا ہے۔ اگلی جلد ان شاء اللہ خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر کلام کرے گی کہ موجودہ زوال سے ہماری نجات اور منصب سیادت پر دوبارہ ہماری تنصیب کیسے ہوسکتی ہے۔

راشد شاز